# Studybeesofficial

*Where Minds Pollinate*

# Urdu Writing Skills

# آپ بیتی

for

## SSC-I

**Follow Our Socials**

studybeesofficial

studybeesofficialpak

studybeesofficialpak

CamScanner

# آپ بیتی

**...ارف:**

آپ بیتی کو انگریزی میں (Autobiography) کہا جاتا ہے یعنی اپنی داستان خود اپنی زبان سے بیان کرنا۔ اس حوالے سے آپ بیتی نثر کی ایسی قسم کو کہتے ...ں جس میں ذاتی واردات اور احوال کا بیان اپنی زبان میں کیا جاتا ہے۔ شاملِ نصاب آپ بیتیاں آپ بیتی کی ایسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں جس میں کسی جانور یا کسی ...بے جان ار چیز کو گویائی دے دی جاتی ہے اور وہ اپنی زبان سے اپنی زندگی کی واردات بیان کرتی ہے۔ زندگی کی اس واردات یا سرگزشت میں آغاز، ارتقا، نشیب و ...ز اور وہ تمام اُتار چڑھاؤ نظر آتا ہے جو ہماری روز مرہ زندگی کا خاص حصہ ہے۔ اس طرح سے آپ بیتی کی یہ قسم بھی شخصی واردات بن جاتی ہے۔

**...ایات:**

آپ بیتی ہمیشہ صیغہ واحد متکلم "میں" لکھی جاتی ہے۔ جس کی آپ بیتی لکھنا مقصود ہو، خود کو وہ چیز تصور کرکے، آپ بیتی لکھی جائے گی۔

آپ بیتی اس قدر طویل نہ ہو کہ داستان بن جائے، اس قدر مختصر نہ ہو کہ لطف غارت ہو جائے اور اس قدر ادبی نہ ہو کہ خیالی لگنے لگے بلکہ اسے شگفتہ اور دلچسپ ہونا چاہیے۔

چونکہ طالب علم کو آپ بیتی اپنے تخیل کے زور سے لکھنی ہوتی ہے، اس لئے اسے چاہیے کہ پہلے وہ مختلف امور، آغاز و انجام، نشیب و فراز اور حالات و واقعات کو ایک خاکے کی شکل میں منطقی ترتیب دے لے۔ یعنی کون سی بات پہلے آئے گی اور کون سی بعد میں اور پھر تخیل کے زور سے اس خاکے میں دلچسپی اور واقعیت کا رنگ بھرتا چلا جائے۔

آپ بیتی لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ طالب علم کا مشاہدہ وسیع اور گہرا ہو۔ وہ زندگی میں جس چیز کو بھی دیکھے اس کے مختلف پہلوؤں پر خوب غور کرے۔ جب تک مشاہدے میں تدبر کی کیفیت پیدا نہیں ہوگی۔ فرضی آپ بیتیاں حقیقت نہیں بن سکیں گی۔

ایسی فرضی آپ بیتی لکھتے وقت آپ کو تخیل سے بھی کام لینا ہوگا۔ ممکن ہے کہ آپ کو جو موضوع دیا گیا ہو اس کے بارے میں آپ کی معلومات بہت کم ہوں اس کمی کو تخیل کے زور سے پورا کیا جائے۔ مگر اپنی خیال آفرینیوں کو ایک حد کے اندر رکھیے۔ فرش کی بات ہو تو عرش تک جانے کی کوشش نہ کیجیے۔ کوئی ایسی بات نہ لکھیے۔ جس سے بات غیر حقیقی ہو کر رہ جائے۔ مثلاً ایک گھوڑے کی آپ بیتی میں اس قسم کے جملے، بیان کو غیر واقعی بنا دیں گے۔ مثلاً: میں اپنے آقا کا وفادار رہا، یہاں تک کہ مجھے موت آگئی یا میں کسمپرسی کے عالم میں مر گیا۔

زبان کو روز مرہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ تخیل کی آمیزش، الفاظ کی شگفتگی اور برمحل اشعار کا استعمال ضروری ہے تاکہ فرضی لبادہ، واقعیت کا رنگ اپنا سکے۔

آپ کسی حیوان یا کسی بے جان چیز کی آپ بیتی لکھیں گے تو ضروری ہے کہ آپ انھیں محسوسات اور جذبات دیں اور یوں لکھیں جیسے گوشت پوست کا کوئی پیکر مسرت آمیز لہجے یا درد بھری زبان میں محوِ گفتگو ہے۔

آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول — عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

- (لٹی محفلوں کی دھول: ماضی کی یادیں۔ عبرت سرائے دہر: دنیا ایک سبق حاصل کرنے کی جگہ ہے)

میں ایک کرسی ہوں اور میرا وجود اس شیشم کے ایک درخت کا مرہونِ منت ہے جو ایک سڑک کے کنارے نصف صدی سے لوگوں کو گرمی سے پناہ ...تا اور اس کی چھاؤں میں لوگ سکون محسوس کرتے تھے۔ لیکن اچانک اسے نیلام کر دیا گیا اور ایک بڑھئی نے اسے آری سے کاٹ ڈالا۔ یہ درخت بڑا قیمتی نکلا اور ...اپنی موٹائی اور کالے رنگ کی وجہ سے فرنیچر بنانے کے لیے بہترین قرار دیا گیا۔

CS CamScanner

CS CamScanner

ایک عرصے تک یہ تالاب کے ایک جوہڑ میں ڈال دیا گیا اور تقریباً سات آٹھ ماہ گزرنے کے بعد اسے نکالا گیا۔ پھر سوکھنے کے لیے اسے اتنا ہی عرصہ دھوپ میں رکھا گیا تاکہ اس کی لکڑی پوری طرح سیزن ہو جائے۔ جب یہ کام پورا ہو گیا تو پھر اسے ایک ٹرالی کے ذریعے آرا مشین تک لے جایا گیا اور وہاں فرنیچر بنانے والے کاریگر کی نگرانی میں اس کے تختے بنوائے گئے۔ پھر یہ تختے بھی کافی دنوں تک سوکھنے کے لیے سائے میں رکھے گئے تاکہ دھوپ میں رکھنے سے ٹیڑھے نہ ہو جائیں۔ ایک دن ایک کاریگر آیا اور اس نے ان تختوں میں سے کچھ تختے منتخب کیے اور انھیں آری سے کاٹ کاٹ کر مختلف سائز کی لریں بنائیں۔ پھر انھیں رندے سے ہموار کیا گیا اور کرسی بنانے کے قابل بنایا گیا۔ یہ مرحلہ بڑا جان گسل تھا۔

یہ عشق نہیں آساں، اتنا ہی سمجھ لیجیے — اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اس کے بعد فرنیچر بنانے والے مستری نے دوسرے مرحلے پر کام شروع کیا اور مختلف سائز کی ہموار شدہ لروں کو جوڑنا شروع کیا۔ اس کا جوڑ جوڑ کیلوں سے چھلنی ہو گیا مگر جب ڈھانچا تیار ہوا تو وہ بڑا خوبصورت اور نئے انداز کا ڈھانچا تھا۔ جسے دیکھنے سے محسوس ہوتا تھا کہ جب اس پر پالش ہو گی اور اس کی بنائی ہو جائے گی تو یہ بڑا دیدہ زیب ہو گا۔ آخر کار وہ مرحلہ بھی آیا جب میرے ڈھانچے کو پالش کرنے والے کاریگر کے سپرد کر دیا گیا۔ اس نے سپرٹ میں مختلف چیزیں ملا کر پالش بنائی۔ پھر میرے جسم پر سپرٹ پالش کی ہلکی سی تہ چڑھا دی جس نے اسے چمکا دیا۔ پھر پوشش کرنے والے کاریگر نے فوم کی تہیں جما جما کر سیٹ کی بڑی خوبصورت پوشش کر دی۔ جس کے بعد میرا وجود مکمل ہو گیا اور میں ایک انتہائی دیدہ زیب کرسی کی شکل اختیار کر گئی۔ یہ میرے اس وجود کا پہلا دن تھا۔ اس کے بعد فرنیچر کی ایک دکان کے شوروم میں مجھے اپنی دوسری بہنوں کے ساتھ گاہکوں کی نمائش کے لیے رکھ دیا گیا۔

دل رکھ تو دیا ہے نگہ یار کے آگے — اُف کر نہیں سکتا ہوں خریدار کے آگے

تقریباً ڈیڑھ ماہ میں شوروم میں پڑی رہی۔ لوگ آتے، دیکھتے اور چلے جاتے۔ پھر ایک دن ایک صاحب آئے اور انھوں نے مجھے خرید لیا۔ ایک پک اپ پر رکھ کر وہ مجھے اپنے کارخانے میں لے گئے اور اپنے اکاؤنٹنٹ کے دفتر میں رکھوا دیا۔ یہ بندہ سارا دن مجھ پر بیٹھا حساب کتاب میں مصروف رہتا۔ اس نے مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں دی۔ اس کا چپراسی روزانہ میری جھاڑ پونچھ کرتا اور صفائی کا ہر ممکن خیال رکھتا لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے حسن و جمال میں فرق آنے لگا تھا۔ میری آب و تاب ماند پڑنے لگی۔ حتیٰ کہ ایک دن اکاؤنٹنٹ کی میز پر رکھا ہوا چائے کا کپ میری سیٹ پر گر گیا۔ ساری چائے میری سیٹ کے فوم میں جذب ہو گئی اور ایک بڑا سا چائے کا دھبا نمودار ہو گیا۔ جس نے سیٹ کو بدنما بنا دیا۔ اکاؤنٹنٹ نے اس پر ایک کپڑا ڈال دیا اور گزارا ہوتا رہا۔

لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ ایک بچہ اکاؤنٹنٹ کے دفتر میں آنکلا۔ اس نے میری سیٹ کے کور کو چاقو سے کاٹ ڈالا۔ جس سے اب میں اس قابل نہ رہی کہ دفتر میں رکھا جائے۔ چنانچہ دفتر سے نکال کر مجھے چوکیدار کے سپرد کر دیا گیا تاکہ وہ سیٹ کی ضروری مرمت کروا کر مجھے اپنے کام میں لا سکے۔ یہ چوکیدار بڑا نیک اور نمازی آدمی تھا۔ تین چار سال میں اس کے زیر استعمال رہی لیکن جو بھی چاہتا وہ مجھے وقتاً فوقتاً اٹھا کر لے جاتا اور استعمال کرتا۔ اس طرح انتہائی بے دردانہ اور غیر محتاط استعمال نے میری خوبصورتی کو بدصورتی میں بدل دیا۔ جگہ جگہ سے میری پالش اڑ گئی۔ گھسیٹنے اور اِدھر اُدھر پھینکنے سے میری ٹانگیں کمزور ہو گئیں۔ ایک دن خدا بھلا کرے کہ چوکیدار کو میرا خیال آیا اور اس نے میری مرمت کروائی جس سے میں کم از کم اس قابل ہو گئی کہ کوئی مجھ پر بیٹھے تو اسے گرنے کا خدشہ نہ ہو۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر — خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر

یہ دور بھی بڑا عجیب تھا۔ میں اکثر اوقات اپنے خوبصورت ماضی کے تصور میں گم رہتی اور پرانی یادوں کے سہارے حال کی تلخیوں کو برداشت کرتی رہتی۔ جو بھی آتا مجھے گھسیٹ کر لے جاتا اور اپنا کام نکالنے کے بعد مجھے وہیں چھوڑ آتا۔ اس طرح کئی کئی گھنٹے مجھے دھوپ میں گزارنے پڑتے اور کئی راتیں تو باہر ہی گزرتیں۔ جب چوکیدار کو میری ضرورت ہوتی تو وہ تلاش کر کے مجھے لے جاتا اور کچھ دیر کے لیے سستا لیتا۔ اکثر اوقات چوکیدار کے بچے کرکٹ کھیلنے کے لیے مجھے گلی میں لے جاتے اور وکٹ کے طور پر استعمال کرتے۔ یہ سلسلہ بھی کافی دیر تک چلتا رہا۔ آخر ایک دن جب بچے کرکٹ کھیل رہے تھے تو گلی میں مٹی کی ایک ٹرالی آئی۔ بچے ایک طرف ہو گئے اور انھیں یاد نہیں رہا کہ مجھے بھی ایک طرف کرنا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹرالی کی ٹکر سے میری ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور مجھے کاٹھ کباڑ کے ڈھیر میں پھینک دیا گیا۔ جہاں اس وقت میں اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہی ہوں۔

CamScanner

اس ڈھیر پر پڑے ہوئے مجھے تقریباً دو ماہ ہو گئے ہیں۔ مرجھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے کاغذ کباڑ کے ساتھ مجھے بھی ردّی میں بیچ دیا جائے گا یا کوئی اٹھا کر مجھ سے اپنا چولھا گرم کرے گا اور یوں میں دنیا کے منظر سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاؤں گی۔

یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین　　　　پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

## گلاب کے پھول کی آپ بیتی

میں ایک گلاب کا پھول ہوں۔ میں آج کسی اجنبی کی قبر پر پڑا ہوں اور گئے گزرے زمانوں کی یاد میں افسردہ ہوں۔ یوں تو میرے حسن و جمال کی وجہ سے مجھے پھولوں کی ملکہ بھی کہا جاتا ہے اور چمن کا بے تاج بادشاہ بھی۔ دنیا کا وہ کون سا ادب ہے جس میں میرے رنگ و بو کے قصائد نہیں ہیں۔ میں نے شاعروں کے تخیل کو پرواز بخشی ہے، ادیبوں کے قلم کو رعنائی عطا کی ہے اور اہل دل کو خدا شناسی کا شعور بخشا ہے۔ یہاں تک کہ انھیں میری ہر پتی معرفت کا ایک حسین ورق نظر آئی۔

گل و بلبل، بہار میں دیکھا　　　　ایک تجھ کو ہزار میں دیکھا

گو میرے لب بند ہیں مگر دل میں ایک الاؤ ہے۔ اس کی تپش کوئی اہل درد ہی محسوس کر سکتا ہے۔ میں پھول بننے سے پہلے ایک شاخ پر منھ بند کلی کی شکل میں تھا۔ میں نے اس عالم میں صبح و شام کی بہت سی گردشیں دیکھیں۔ موسموں کے بدلتے ہوئے مزاج کی تلخیوں کو محسوس کیا۔ میں ہوا کے بے رحم جھونکوں کی چھیڑ چھاڑ سے متاثر ہوتا رہا۔ قصہ مختصر، میں نے کلی سے پھول بننے کے لیے کتنے ہی سخت مرحلوں سے گزرا۔

شفق لہو میں نہائی، سحر اداس ہوئی　　　　کلی نے جان گنوا دی، شگفتگی کے لیے

اب میں ایک ہنستا اور مسکراتا ہوا گلاب کا پھول تھا۔ میری آنکھ کھلتے ہی چمن کی ہر شے نے مسرت و شادمانی سے میرا استقبال کیا۔ مالی مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو رہا تھا۔ شبنم میرے رخساروں کو چوم چوم کر نہال ہو رہی تھی۔ بلبلیں میرے حسن کو دیکھ کر گیت گا رہی تھیں۔ بھونرے میرا طواف کر رہے تھے اور مسرت سے کانٹوں کی نوک پر بھی سرخی چمک رہی تھی۔ مگر کسے معلوم تھا کہ یہ عیش چند روزہ ہے اور میری زندگی کتنی ناپائیدار ہے۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ میں مسکرا رہا ہوں۔ مگر انھیں کیا پتا کہ میری مسکراہٹ میں درد و غم کے کتنے طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ یہ تو میر تقی میر کی دیکھنے والی نگاہ تھی جو میرے تبسم ہی کو کل زندگی سمجھا تھی:

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات　　　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

میں بھی محسوس کر رہا تھا کہ میرا یہ تبسم عارضی ہے اور یہ مسکراہٹ فنا کا پیش خیمہ ہے۔ مگر یہ عارضی سا تبسم غنیمت بھی تھا اور قابل قدر بھی۔ میں سورج کی شعاعوں سے لطف لیتا تھا۔ شبنم مجھے ہر صبح غسل دیتی تھی۔ ہوا جھولا جھلاتی تھی اور چمن کے پرندوں کے گیت میری دل لگی کا سامان کرتے تھے۔ مگر ہر لمحہ میرے دل کو کھٹکا لگا رہتا تھا۔ کسی ان ہونی بات اور کسی حادثے کا۔

میرے دل میں ایک انجانا سا خوف تھا جو مجھے ہر لحظہ بے چین رکھتا تھا۔ مجھے گرم ہواؤں سے بھی ڈر لگتا تھا کہ میری نزاکت ان کی متحمل نہ تھی۔ مجھے شرارتی لڑکوں سے بھی خوف تھا جو مجھے دیکھتے ہی توڑنے کے لیے لپکتے تھے۔ بسا اوقات اپنے دفاع کے لیے مجھے کانٹوں سے کام لینا پڑتا تھا۔ یوں ان کی انگلیاں، کانٹوں کی مدافعت سے گل رنگ ہو جاتی تھیں۔ سب سے زیادہ میں شہد کی مکھیوں سے تنگ تھا کیوں کہ انھیں کوئی شے بھی روک نہیں سکتی تھی۔ وہ بے پروا ہو کر مجھ پر ٹوٹ پڑتی تھیں، بے رحمی سے میرا رس چوستی اور مجھے نڈھال چھوڑ جاتی تھیں۔ مالی جو میرا سب سے بڑا محافظ تھا، اس سلسلے میں وہ بھی بے بس تھا۔ الغرض زندگی اسی ڈھب پر گزر رہی تھی۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے　　　　عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

خوشی اور غم کے ملے جلے عالم میں زندگی گزر رہی تھی کہ ایک دن ایک افسردہ شخص باغ میں آیا۔ اس وقت مالی موجود نہیں تھا۔ اس نے شاخوں سے پھولوں کو نوچنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کا ہاتھ اس شاخ پر بھی آ گیا، جہاں میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے ایک شان بے نیازی کے ساتھ مجھے توڑا اور بغیر کسی احتیاط کے ایک تھیلے میں ڈال لیا۔ جس بات کا دھڑکا تھا وہ ہو چکی تھی۔ میں دوسرے پھولوں کے ساتھ اس تاریک تھیلے میں دم بخود پڑا تھا۔ میرا شباب پژمردگی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا اور موت کی پیلاہٹ میرے رگ و ریشے میں ہولے ہولے سما رہی تھی۔

CamScanner

اس نے تھیلے کو بغل میں دبایا اور ایک نامعلوم سفر پر چل نکلا۔ راستے میں بازار بھی آئے کہ لوگوں کی ملی جلی آوازیں میرے کانوں میں پڑتی رہیں۔ مگر وہ چلتا رہا یہاں تک کہ ایسی وادی میں جا نکلا جہاں ہُو کا عالم معلوم ہوتا تھا۔ جہاں بلبل کی چہک تھی نہ کسی انسان کی آواز۔ خاموشی کی اس دنیا میں وہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر رک گیا۔ میرے دل میں مسرت کی ایک ہلکی سے لہر دوڑی کہ شاید ان دم گھٹو لمحوں سے نجات کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ اچانک اس نے تھیلے کو بغل سے نکالا اور ایک شان بے نیازی سے مٹی کے ایک ڈھیر پر الٹ دیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ ایک قبر تھی۔ تقدیر کی شوخی دیکھیے کہ کہاں بہار کا حسن اور چمن کی شادابی اور کہاں قبرستان کا تنہا، اداس اور افسردہ گوشہ۔ میرا ڈر اب حقیقت بن چکا تھا۔

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

یہ میری آپ بیتی ہے۔ مہد سے لے کر لحد تک کی کہانی ہے۔ جس میں عبرت بھی ہے اور نصیحت بھی، مسرت بھی ہے اور درد بھی، شگفتگی بھی ہے اور اداسی بھی۔ میں پھول ہوں، جس کا رنگ دل کش تھا اور جس کی مہک دل آویز تھی۔ جو کسی گل دستے کی خوب صورتی کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ کسی دوشیزہ کے بالوں کو حسن بھی عطا کر سکتا تھا۔ کسی تقریب کی رعنائی کو بھی دوبالا کر سکتا تھا مگر تقدیر کا لکھا کیسے مٹ سکتا ہے۔ میری تقدیر میں اسی گمنام قبر پر کچھ لمحوں کے لئے مسکرانا لکھا ہے۔ کون جانتا ہے کہ میرے دل میں درد نے کیا آگ لگا رکھی ہے اور کیسے میں نے اپنے لبوں پر تبسم چپکا رکھا ہے۔ شاید اسی "جبری تبسم" کا دوسرا نام زندگی ہے۔ فطرت کے انداز اور قدرت کے دستور کو کون بدل سکتا ہے۔

## ایک پھٹے پرانے جوتے کی آپ بیتی

میں ایک پرانا جوتا ہوں۔ اس وقت میری حالت اتنی دگرگوں ہے کہ ناقابلِ بیان ہے۔ میرا اچمڑا، میری رنگت، میری سج دھج سب قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ مجھے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ عمارت شاندار رہی ہوگی۔ بس یوں سمجھیے کہ:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

مگر میرا ناگفتہ بہ حال، ایک شاندار ماضی کا حامل ہے۔ میرا چمڑا ایک خوبصورت گائے کی کھال سے لیا گیا تھا۔ وہ گائے حسین و جمیل مرغزاروں میں چرتی تھی۔ جوانی، حسن اور عمر کسی سے وفا نہیں کرتی۔ یہ ہوا کا ایک جھونکا ہے، آیا اور گزر گیا۔ وقت کے ہاتھوں یہی گائے بوڑھی ہو گئی۔ اس کی خوبصورت کھال ہڈیوں سے چمٹ گئی اور وہ خود ہڈیوں کا ایک ڈھانچا بن کر رہ گئی۔ وہی مالک جو اسے بڑی محبت سے رکھتا تھا، اس سے بیزار رہنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اسے ایک قصاب کے ہاتھ بیچ دیا۔ جس نے اسے ذبح کیا اور کھال الگ کر دی۔ اسے نمک لگا کر خشک کیا گیا۔ جہاں سے اسے ایک ٹینری کے مالک نے خرید لیا۔ وہاں اسے مختلف مسالوں سے صاف کیا گیا اور پھر چمڑے کی شکل دے دی گئی۔ ان تمام جاں سوز مراحل سے گزرنے کے بعد اسے ایک گودام میں بند کر دیا گیا۔ ایک دن ایک بوٹ بنانے والے کارخانے دار نے اسے خرید لیا۔ پھر اس کارخانے میں اسے بے شمار ٹکڑوں کی شکل میں کاٹا گیا اور کئی مشینوں سے گزارا گیا۔

کئی مراحل سے گزرنے کے بعد آخر کار میں ایک چمک دار اور دیدہ زیب بوٹ کی شکل میں وجود میں آیا۔ یہ میری اس زندگی کا پہلا دن تھا۔ یوں تو میرے اردگرد بہت سے بوٹ تھے لیکن میری چمک دمک، بناوٹ اور انداز سب سے نرالا تھا۔ میری چمک دمک ہر دیکھنے والے کو متاثر کرتی تھی۔ پھر مجھے اور مجھ سے ملتے جلتے ایک بوٹ کو گتے کے ایک ڈبے میں بند کر دیا گیا۔ ایک جوتے بیچنے والے نے مجھے خریدا اور دکان میں سجا دیا۔ وہاں ہمارا قیام چند روز رہا۔ اس دوران ہمیں کئی گاہکوں نے اپنے پاؤں میں پہن کر دیکھا۔ لیکن دکان دار کا کسی بھی گاہک سے بھاؤ طے نہ ہو سکا۔ وہ میری حیثیت، اہمیت اور حسن کے پیش نظر زیادہ پیسے مانگتا تھا۔ ایک دن ایک آدمی آیا۔ ہمارا حسن اس کی نگاہوں میں سما گیا اور اس نے ہمیں خرید لیا اور اپنے گھر لے گیا۔

وہ ایک امیر آدمی تھا وہ ہمیں پہن کر سنگ مرمر کے فرش اور قالینوں پر پھرتا تھا۔ دفتر جاتا تھا۔ ہمیں پہلے ہی دن اندازا ہو گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑا سرکاری افسر ہے۔ ہم اس ٹھاٹھ میں بڑے خوش تھے۔ لیکن چند دن گزرنے کے بعد ہمیں یہ بھی انکشاف ہوا کہ وہ ایک راشی افسر تھا۔ وہ دوسروں کے کام جان بوجھ

خراب کر دیتا تھا تا کہ لوگ اپنے کاموں کی تکمیل کے لیے اسے رشوت دیں۔ ہمیں یہ جان کر بڑا صدمہ لگا۔ ہمیں اس پر رحم آتا تھا کہ وہ کیسے اپنا انجام بھولا ہوا تھا۔ حالاں کہ "رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں جہنمی ہیں"، یہ جملہ اس کے دفتر میں آویزاں تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت ... احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اس کے نوکر ہر روز ہمیں پالش کرتے تھے۔ اس کے پاس جوتوں کے اور بھی بہت سے جوڑے تھے۔ اس لئے وہ ہمیں کبھی کبھی پہنتا تھا۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ میرے جسم کے اوپر والے حصے میں ایک کیل کی وجہ سے خراشیں لگ گئیں۔ جس کی وجہ سے میرا وجود بدنما نظر آنے لگا۔ اس نے ہمیں ایک نوکر کے سپرد کر دیا۔ شروع شروع میں اس نے بڑی حفاظت سے رکھا اور کئی بار ہمیں پالش کیا۔ وہ ہمیں تمام دن پہنتا تھا اور ہر وقت کام کرتا رہتا تھا۔ کبھی بازار جاتا تھا، کبھی ریلوے سٹیشن پر اور کبھی ہوٹلوں میں۔ غرض ہم ہر لحاظ سے خوش تھے کہ خوب سیر ہو رہی ہے۔ مگر مسلسل استعمال نے ہمارے قُویٰ کو مضمحل اور جسم کو چور چور کر دیا تھا۔ ہمارا رنگ و روغن اڑ گیا تھا۔ ہم جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے اور ہمارے سینے پر بے شمار زخم اور داغ نمایاں ہو گئے تھے۔ ہم بد وضع ہو چکے تھے اور ہمارا انگ انگ درد سے لبریز تھا۔

درد ہو دل میں تو دوا کیجے ... دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجے

ایک دن ہم گھر کے برآمدے میں پڑے ہوئے تھے کہ ایک کتا میرے ساتھی کو اٹھا کر لے گیا اور میں اکیلا رہ گیا۔ نوکر نے مجھے اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ کچھ دیر بعد کچرا اُٹھانے والے آئے تو انھوں نے مجھے اُٹھا کر کچرے کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ اور اب میں اس کچرے کے ڈبے میں پڑا ہوا ہوں۔ اپنے ماضی کی حسین یادوں سے اپنے سینے کے زخموں کو سہلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہر گھڑی جو گزر رہی ہے، وہ کسی قیامت سے کم نہیں ہے۔

ہر نَفَس عمرِ گزشتہ کی میت ہے فانیؔ ... زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

(نَفَس: سانس۔ عمرِ گزشتہ: گزر جانے والی عمر۔ میت ہے: موت ہے۔)

## ایک کتاب کی آپ بیتی

میں لائبریری کی ایک کتاب ہوں لیکن آج جس حال میں ہوں، وہ ناقابلِ بیان ہے۔ میری جلد خستہ ہو چکی ہے، کاغذ پیلے پڑتے پڑتے اس حالت کو پہنچ چکے ہیں کہ ہاتھ لگاتے ہی خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھڑنے لگتے ہیں۔ لیکن میں ہمیشہ ایسی نہیں تھی۔ آیئے میں آپ کو اپنی کہانی سناتی ہوں۔ مجھے آج بھی اپنا بھی اپنا وہ پہلا دن یاد ہے۔ جب شعور کی آنکھ کھولی تو میں نے خود کو شہر کے ایک مشہور چھاپہ خانے میں پایا۔ مجھے لاہور کے ایک مشہور ناشر نے چھاپا تھا۔ میرا نام "بانگِ درا" رکھا گیا۔ میں برصغیر پاک و ہند کے عظیم شاعر، مفکر اور فلسفی علامہ اقبالؒ کے خیالات عالیہ کا حسین و جمیل عکس تھی۔ یہ وہی اقبال ہیں جنھوں نے دعا مانگی تھی:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری ... زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

پھر یوں ہوا کہ ان کی یہ دعا پوری ہوئی۔ میں ان کے کلام کی شمع لیے گھر گھر پھرتی رہی۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی بھی ہے کہ میں محض ایک کتاب نہیں تھی بلکہ ایک پیغام اور روشنی تھی، جو اقبال کے دل سے نکلی تھی۔

ایک دن ہمیں چھاپہ خانے سے ایک دکان پر بھیج دیا گیا۔ دکان کے مالک نے میری بہت سی دوسری بہنوں کے ساتھ مجھے اپنی دکان میں سجا لیا۔ بہت سے خریدار آئے، وہ بہت سی کتابیں خریدتے رہے مگر میں کسی کی نگاہِ انتخاب میں نہ آئی۔ ایک دن ایک خوبصورت شخص دکان میں داخل ہوا۔ اس نے مجھ سمیت علامہ اقبال کی تمام تصانیف خریدیں۔ وہ مجھے اپنے شہر میں لے آیا اور ایک الماری میں سجا دیا۔ اس الماری میں اور بھی بہت سی کتابیں تھیں جب کہ کمرے میں بہت سی الماریاں تھیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ایک لائبریری ہے۔ مجھ پر ایک مہر لگا دی گئی تھی اور اس پر ایک نمبر بھی لکھ دیا گیا تھا۔ پھر ایک الگ رجسٹر میں میرا اندراج بھی کر دیا گیا۔

موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو ... پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

خیر ان صاحب کے ہاتھ سے نکلے ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ ایک سنجیدہ اور شائستہ انسان آیا۔ اس نے مجھے اٹھایا اور اپنے نام میرا اجرا کرایا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا، وہ ایک پروفیسر تھا۔ اس نے بڑی محبت اور پیار کے ساتھ مجھے پڑھا اور میرے سینے پر جو لاتعداد خراشیں تھیں انھیں دیکھ کر بار بار افسوس بھی کیا کہ قارئین میں مطالعے کا سلیقہ مفقود ہو گیا ہے۔ اس کی صحبت میں مجھے انتہائی مسرت اور سکون ملا، وہ مجھے کالج ساتھ لے جاتا اور اپنے شاگردوں کو میرے بہت سے اشعار سناتا۔ یہ شعر اپنے اندر بصیرت اور حکمت کی ایک دنیا لیے ہوئے تھے۔ اس نے پندرہ دن کے بعد مجھے واپس کر دیا۔ بلاشبہ یہ میری زندگی کے خوبصورت ترین دن تھے۔ میں بہت سے لوگوں تک وہ روشنی پہنچانے کا ذریعہ بنی تھی جس کی اقبال نے دعا مانگی تھی۔ سچ ہے کہ چراغ جلتا رہے تو روشنی باقی رہتی ہے۔

کہیں کوئی چراغ جلتا ہے     کچھ نہ کچھ روشنی رہے گی ابھی

یوں میں بہت سی خوشگوار یادیں سینے میں چھپائے، اپنے خانے میں پہنچ گئی۔ پھر ایک اور نوجوان آیا جس کے چہرے سے درشتی ٹپکتی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے مجھے اٹھایا۔ مجھے اس کا طرزِ عمل کھٹکا اور میں مستقبل کے اندیشوں سے سے لرز گئی۔ اس نے بڑے غلط طریقے سے مجھے استعمال کیا۔ یہاں تک کہ اپنی پسندیدہ نظمیں بلیڈ سے کاٹ لیں۔ میں اس ظلم وستم کے خلاف سراپا احتجاج تھی مگر جب دلوں پر مہر لگ چکی ہو تو احساس پتھر ہو جایا کرتا ہے اور آہیں دم توڑ دیا کرتی ہیں:

وفا، اخلاص، قربانی، محبت     اب ان لفظوں کا پیچھا کیوں کریں

آخر اس کی مشقِ ستم ختم ہوئی اور اس نے مجھے لا کر واپس کر دیا۔ لائبریرین نے بھی بغیر دیکھے مجھے الماری میں رکھ دیا۔ ایک سال کے بعد جب بوسیدہ کتابیں الگ کی گئیں تو مجھے بھی چھانٹ دیا گیا اور دوسری کتابوں کے ساتھ ایک کباڑیے کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ جس نے مجھے ایک سڑک کے کنارے زمین پر سجا دیا۔ میں اس وقت سے راہ گزر میں، اپنی تقدیر کی تصویر بنی پڑی ہوں کہ نہ جانے کون آئے گا اور مجھے کہاں لے جائے گا۔

اپنی قسمت سے ہے مفر کس کو     تیر پر اُڑ کے بھی نشانے لگے

## قربانی کے بکرے کی آپ بیتی

میں ایک بکرا ہوں۔ جسے سنتِ ابراہیمی کی پیروی میں قربان کرنے کے لیے خریدا گیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید ہمارے سینے میں دل اور جذبات نہیں ہوتے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں بھی ایک جاندار ہوں۔ اگرچہ اللہ نے مجھے حیوان بنایا ہے مگر دل بھی دیا ہے۔ جو جذبات اور احساسات رکھتا ہے۔ آیئے میں آپ کو اپنی داستانِ حیات سناتا ہوں۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت کہ درد سے بھر نہ آئے کیوں     روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

(سنگ وخشت: پتھر اور اینٹ)

میں ایک خوبصورت بکرا ہوں۔ میرا سیاہ اور سفید رنگ بڑا جاذب نظر ہے۔ میرے جسم کی بناوٹ اور صحت مندی تو ہر دیکھنے والے کو اچھی لگتی ہے مگر یہ سب کچھ ایسے ہی مجھے حاصل نہیں ہوا۔ اس کے پیچھے ایک لمبی داستان ہے۔ میں آج سے ٹھیک ایک سال اور دو ماہ پہلے سرگودھا کے ایک چک میں ایک بکری کے ہاں پیدا ہوا۔ میری ماں کو پیار سے اس کا مالک "رانی" کہتا تھا۔ میری پیدائش پر وہ بہت خوش ہوا اور اس نے عام دستور سے ہٹ کر میری ماں کا سارا دودھ میرے پینے کے لیے وقف کر دیا۔ اس کے پاس اور بکریاں اور ان کے بھی بچے تھے۔ مگر انھیں میری طرح اپنی ماؤں کا سارا دودھ پینے کی اجازت نہیں تھی۔ میں اپنی ماں کے ساتھ سارا دن چراگاہ میں گھومتا رہتا اور پھر میں نے بھی آہستہ آہستہ گھاس چرنا سیکھ لیا۔ ماں کا پورا دودھ پینے اور عمدہ قسم کی گھاس چرنے سے میرا جسم خوب خوب موٹا تازہ ہونے لگا اور بچپن ہی میں پورے، یوڑ کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ وہ بھی کیا خوبصورت دن تھے۔

اداس شام کی یادوں بھری سلگتی ہوا     ہمیں پھر آج پرانے دیار لے آئی

میرے مالک کی ساتھ آٹھ سال کی ایک لڑکی تھی جو مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ وہ اکثر اوقات مجھے گود میں اٹھا لیتی تھی۔ میرے جسم کو سہلاتی اور سر کو بڑے پیار سے تھپتھپاتی تھی۔ مجھے اس کی محبت سے بڑا سکون ملتا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی دم ہلاتا ہوا اور اچھلتا کودتا اس کے پاس آجاتا تھا۔ وہ کبھی کبھی مجھے بنے

CamScanner

ہوئے چنے کھلاتی تھی اور کبھی روٹی کے چند ٹکڑوں سے میری تواضع کرتی تھی۔ یہ دن میری زندگی کے بڑے حسین دن تھے۔ کوئی فکر نہ غم، گھومنا پھرنا، اچھلنا کودنا اور پیٹ بھر کے ماں کا دودھ پینا۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ ایک شخص میرے مالک سے ملنے کے لیے آیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے میرے مالک سے مجھے خرید لیا اور اپنے ساتھ مجھے اپنے گھر لے آیا۔

مجھے یہ نیا گھر اچھا نہیں لگا۔ میں ساری رات اپنی ماں اور مالک کی بیٹی کی جدائی کے غم میں ممیاتا رہا۔ میرا نیا مالک مجھے پیار کرتا، مجھے چپ کرانے اور میرا دل لگانے کے لیے کھانے کی اچھی اچھی چیزیں پیش کرتا مگر مجھے کوئی چیز بھی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اپنے پیاروں سے جدائی کا غم کا میرے لیے سوہانِ روح بنا رہا اور ساری رات یوں ہی ممیانے اور چلاتے گزر گئی۔ خدا خدا کر کے دن چڑھا اور میرے نئے مالک کے بچوں نے مجھے خوب تنگ کیا۔ میں اس تبدیلی پر دل ہی دل میں بڑا پریشان تھا۔ آخر کار مجھے حالات سے سمجھوتا کرنا پڑا اور میں نے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیا۔

میرا نیا مالک بہت اچھا آدمی تھا۔ وہ میرے کھانے پینے کا بہت خیال رکھتا تھا۔ دودھ میں چنے کی دال بھگو کر مجھے کھلاتا نرم نرم برسین کھانے کے لیے دیتا۔ کبھی کبھی وہ مجھے پھل اور مٹھائی بھی کھلاتا۔ صبح کے وقت مجھے لسی بھی پلاتا اور جب کبھی گرمی زیادہ ہوتی تو مجھے شکر کا شربت پینے کے لیے دیتا۔ میں اس کے حسنِ سلوک، دیکھ بھال اور محبت سے بڑا متاثر ہوا اور نئے ماحول کی آسائشوں میں کھو کر ماضی کے لمحوں کو بھول گیا۔

نئے مالک کی دیکھ بھال اور ٹہل سیوا نے رنگ دکھایا اور میں خوب موٹا تازہ ہوتا چلا گیا۔ ایک دن میرے مالک نے ایک خوبصورت چمڑے کا پٹا میرے گلے میں ڈال دیا اور میرے اگلے پاؤں میں جھانجھریں پہنا دیں۔ جس سے میری چال میں ایک حسن پیدا ہو گیا اور جب میرا مالک صبح کی سیر کرنے نکلتا تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔ وہ میری جھانجھروں سے پھوٹنے والی موسیقی سے بڑا لطف اندوز ہوتا اور ہر رہ گیر کی نظر میری طرف اُٹھ جاتی۔ لوگ میری خوبصورتی اور صحت مندی کی وجہ سے مجھے پیار کرتے اور میرے مالک کی دیکھ بھال کی تعریف بھی کرتے جس سے میرا مالک بڑا خوش ہوتا۔

وقت یوں ہی گزرتا رہا میرے کھانے پینے اور دیکھ بھال میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میری خوراک دگنا کر دی گئی اور سب گھر والے مجھے پیار کرتے۔ میرے مالک کا ایک بیٹا تو اکثر اوقات مجھے ٹہلانے کے بہانے کئی کئی گھنٹے اپنے ساتھ پھراتا رہتا۔ ہرے بھرے میدانوں، سرسبز و شاداب جھاڑیوں اور کھیتوں میں چراتا رہتا اور یوں اپنی محبت کا اظہار کرتا۔ سچ پوچھیے تو مجھے بھی اس کے ساتھ محبت ہو گئی تھی۔ اگر وہ کسی دن مجھے کچھ دیر کے لیے نظر نہ آتا تو میرے دل کی بے چینی بڑھ جاتی اور میں اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جاتا۔

آج سے دو تین دن پہلے جب میرا مالک ٹہلانے کے لیے مجھے ساتھ لے گیا تو میں نے دیکھا کہ اور لوگ بھی اپنے ساتھ اپنے اپنے بکروں اور چھتروں کو ٹہلانے کے لیے اپنے ساتھ کھینچ کھینچ کر اور گھسیٹ گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ اتنے سارے میرے ہم جنس کہاں سے ٹپک پڑے اور چلنے سے کیوں گریزاں ہیں۔ میں تو اپنے مالک کے پیچھے پیچھے اس کے اشاروں پر ناچتا اور کودتا ہوا جا رہا تھا۔ مگر وہ تھے کہ چلنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ اکثر بڑے زور زور سے ممیا رہے تھے اور جو چپ تھے وہ گھسیٹ گھسیٹ کر پاؤں اُٹھا رہے تھے۔ کچھ بکروں اور چھتروں کے مالک اپنے ہاتھ میں برسین لیے انھیں للچا للچا کر چلنے پر مجبور کر رہے تھے۔ مجھے اچانک ماحول کی اس تبدیلی پر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک دم اتنے بکرے اور چھترے کہاں سے نازل ہو گئے ہیں۔ میں نے بڑا غور کیا اور کوئی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔

میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ دور سے ایک بکرا اپنے مالک کے ہاتھ سے رسی چھڑا کر بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور میرے منھ سے اپنا منھ ملا کر محبت کا اظہار کرنے لگا۔ میں نے اسے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے؟ یہ اتنے سارے بکرے اور چھترے اچانک کہاں سے نمودار ہو گئے ہیں؟ اس نے مجھے بتایا کہ عید الاضحی قریب ہے اور لوگوں نے سنتِ ابراہیمی کو ادا کرنے کے لیے قربانی کے یہ بکرے خریدے ہیں۔ انھیں بقرہ عید کے دن قربان کیا جائے گا۔ مجھے بہت دُکھ ہوا اور میں نے اس کے ساتھ افسوس کا اظہار کیا اور اپنے ساتھ اپنے مالک کی محبت کا ذکر کر کے اسے بتایا کہ وہ مجھے قربان نہیں کرے گا۔ وہ کہنے لگا کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تمھیں قربان نہیں کیا جائے گا بلکہ تمھیں تو خوب ٹہل سیوا کر کے اسی مقصد کے لیے پالا گیا ہے، اس لیے قربان ہونے کے لیے تیار رہو۔

CamScanner

CS CamScanner

مجھے اس بکرے کی باتوں نے غمگین کر دیا ہے اور اب یقین ہو چلا ہے کہ پرسوں بقرہ عید پر مجھے بھی قربان کر دیا جائے گا۔ لیکن دل کے کسی گوشے میں یک گونہ اطمینان بھی ہے کہ میں ایک عظیم انسان کی سنت کی تکمیل کے لیے قربان کیا جا رہا ہوں۔ میری زندگی ایک عظیم مقصد کے لیے قربان ہو رہی ہے۔ یقینا اس وجہ سے میں آپ کی محبت بھری نظروں کا مستحق بھی ہوں۔

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی        حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

## ایک پھٹے پرانے کوٹ کی آپ بیتی

میں ایک پرانا کوٹ ہوں اور آج میری حالت اتنی دگرگوں ہو چکی ہے کہ کوئی مجھے پہننا تو دور، میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ میرا رنگ ڈھنگ، میری رعنائی، میری بناوٹ، میرا کپڑا سب بوسیدہ ہو چکا ہے۔ میرے بٹن ٹوٹ چکے ہیں اور جابجا باہر نکلے ہوئے دھاگے اپنی بے بسی کی کہانی کہہ رہے ہیں۔ لیکن یہ مت سمجھیے کہ یہ بوسیدگی اور یہ خستگی ہمیشہ سے تھی۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب مجھے شہر کے ایک معروف کارخانے میں بنایا گیا تھا۔ میرے لیے اون ایک بہت ہی اعلیٰ نسل کی بھیڑ سے لی گئی تھی۔ جسے کارخانے میں کئی مراحل سے گزار کر ایک رنگین کپڑے کی صورت دی گئی تھی۔ پھر ایک ماہر ہاتھوں نے مجھے سیا تھا اور یہ جمیل شکل عطا کی تھی۔ یہ سب کچھ میرے حافظے میں ابھی بھی محفوظ ہے لیکن دل یہی چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ اب بھول جاؤں۔ ہائے:

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب        چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ٹھہریے! میں آپ کو ذرا تفصیل سے اپنی کہانی سناتا ہوں۔ یہ شکل اختیار کرنے سے قبل مجھے بہت سے جاں گداز مرحلوں سے گزرنا پڑا تھا۔ ایک بھیڑ سے اون لی گئی۔ پھر اس اون کو کارخانے میں بھیجا گیا۔ اسے مشین میں دھنا گیا اور پھر اسے دھاگے کی شکل دے دی گئی۔ پھر اس دھاگے سے کپڑا بنایا گیا۔ اور مختلف رنگوں کی مدد سے اس پر ایک ڈیزائین تخلیق کیا گیا۔ اس کپڑے کو کارخانے میں کام کرنے والے ماہر درزیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ جنھوں نے مجھے اپنی ماہرانہ کوششوں سے ایک دیدہ زیب کوٹ کا روپ دے دیا۔

جب میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو خود کو اس معروف کارخانے میں پایا۔ میرے ارد گرد کوٹ ہی کوٹ تھے۔ ہر انداز، ہر بناوٹ اور فیشن کے کوٹ تھے۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ میں ان تمام کوٹوں سے ممتاز تھا۔ میرا رنگ، انداز، بناوٹ اور فیشن سب سے جدا تھا۔ حتی کہ میری قیمت بھی سب سے زیادہ رکھی گئی۔ پھر ایک دن ہمیں ایک گاڑی میں لاد دیا گیا اور یہاں سے ہمیں شہر کے ایک بڑے سٹور پر بھیج دیا گیا۔ جہاں ہمیں بڑے ناز و انداز سے شوکیسوں میں سجا دیا گیا۔ میرا حسن ہر گزرنے والے کو متاثر کر رہا تھا اور بعض لوگ تو مجھے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے لیکن قیمت دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتے۔ ایک دن ایک نوجوان آیا۔ اس نے مجھے خاصا پسند کیا، میری قیمت ادا کی اور مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس سٹور میں رہتے مجھے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اس لئے مجھے اس جگہ سے محبت سی ہو گئی تھی۔ یہ جدائی مجھ پر شاق گزری۔ مگر میں نے بدلتے حالات کے تحت خود کو بدل لیا۔

وہ نوجوان مجھے لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ اس کا گھر ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ میں اتنے بڑے گھر کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ سامنے اور پیچھے بڑا سا لان تھا۔ یہ دو منزلہ مکان تھا۔ جس میں وہ اپنے بیوی بچوں اور والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے مجھے لے جا کر ایک الماری میں لٹکا دیا۔ جہاں میرے جیسے کئی اور دیدہ زیب کوٹ پہلے سے لٹکے ہوئے تھے۔

خیر وہ دن بھی آن پہنچا جب اس نے مجھے پہلی بار پہنا۔ میں اس کے جسم پر خوب جچ رہا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا دیر تک خود کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک دبی دبی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ اسی دوران اس کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے بھی تعریف کی۔ پھر وہ نوجوان مجھے پہن کر دفتر چلا گیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک بڑا سرکاری افسر تھا۔ وہ سارا دن کام کرتا رہا۔ وہ ایک فرض شناس افسر تھا اور اپنا کام انتہائی ایمان داری سے کرتا رہا۔ اسی دوران اس سے ملنے کے لیے کچھ ایسے لوگ بھی آئے جو غریب تھے اور ان کا ایک انتہائی ضروری کام رکا ہوا تھا۔ اس نوجوان نے نہ صرف ان کی عزتِ نفس کا خیال رکھا بلکہ ذاتی تگ و دو سے ان کا کام اسی وقت کروا دیا۔ وہ لوگ اسے دعائیں دیتے ہوئے گئے۔ بلاشبہ دوسروں کے کام آنا ایک ایسی نیکی ہے جس کا اجر بہت زیادہ ہے۔

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر        خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

کچھ عرصے کے بعد نوجوان نے مجھے دھلائی کے لئے ایک ڈرائی کلینر کے حوالے کر دیا۔ دھویا جانا یقیناً ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ وہاں مجھے بڑے بڑے سیمرز کے ذریعے صاف کیا گیا اور بعد میں مجھے استری کیا گیا۔ ان مرحلوں سے مجھے بارہا گزرنا پڑا۔ میں بڑے صبر کے ساتھ یہ تمام تکالیف برداشت کرتا رہا اور ہر حال میں اپنے مالک کا رفیق رہا۔

چند سال بعد میرا رنگ دھندلا گیا اور حسن ماند پڑ گیا۔ میرا مالک مجھ سے کھچا کھچا رہنے لگا۔ اس کے دل میں پہلی سی محبت باقی نہ رہی۔ یہ میرے لئے ایک اشارہ تھا کہ اب مسرت کا دور بیت گیا ہے۔ پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جس کا خدشہ تھا۔ میرے مالک نے ایک نیا کوٹ خرید لیا اور مجھے اپنے ایک ملازم کے حوالے کر دیا۔ وہ خوشی خوشی مجھے لے کر اپنے گھر آ گیا۔ اس کا گھر چھوٹا سا تھا۔ وہ ایک غریب آدمی تھا۔ جس کا گزر بسر بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ وہ جتنا کماتا تھا، وہ سب مہنگائی کے ہاتھوں نذر ہو جاتا تھا۔ لیکن ان مشکلات کے باوجود وہ صبر شکر کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ اور اس شعر کی مثال تھا:

ہر حال میں رہا جو ترا آسرا مجھے مایوس کر سکا نہ ہجوم بلا مجھے

وہ مجھے مسلسل استعمال کرتا رہا۔ اس کی بیوی مجھے گھر ہی پر صابن سے دھو لیا کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ میرا رنگ روپ پھیکا پڑنے لگا۔ پھر ایک دن اس نے مجھے پھیری والے کو دے دیا اور میرے عوض چند چینی کے برتن لے لیے۔ میں اس کے ساتھ تمام دن مختلف گلیوں اور محلوں میں گھومتا رہا۔ شام کو وہ شخص مجھے ایک دکان پر لے گیا۔ جہاں اور بھی بہت سے پرانے کپڑے تھے۔ اس نے مجھے وہاں فروخت کر دیا۔ میرے نئے مالک نے مجھے ایک گٹھڑی میں باندھ کے رکھ دیا۔ اب میں اپنی زندگی کے باقی ماندہ لمحات اسی دکان پر گزار رہا ہوں۔ گویا زندگی کا دن گزر چکا ہے اور شام ہو چکی ہے۔ اب یوں لگتا ہے کہ جیسے موت ہی ان مصائب سے چھٹکارا ہو گی۔

دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہو گئی پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنج مزار میں
(کنج مزار: مزار کا کونہ مراد قبر)

## ایک گھوڑے کی آپ بیتی

دوستو! اب بڑھاپا میرے رگ و ریشے میں سما چکا ہے۔ بدن کمزور اور ٹانگوں کے جوڑ متورم ہو چکے ہیں۔ سبزہ زار میں اپنے حال کی تلخیوں کو ماضی کی سہانی یادوں سے بہلانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ جب عمر رفتہ کو آواز دینے کی کوشش کرتا ہوں تو تصور ان دنوں کی یادیں تازہ کر دیتا ہے جب میں جوان اور خوبصورت تھا۔ وہ بھی کیا بے فکری اور خوشی کا زمانہ تھا:

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب میں محض ایک بچھڑا تھا۔ وہ زمانہ میری زندگی کا ایک سنہری دور تھا۔ میں اس دور کی یادوں کو زندگی کی ایک قیمتی متاع سمجھتا ہوں۔ میری ماں، جو کہ ایک خوبصورت، توانا اور بہادر گھوڑی تھی، مجھے پیار سے اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ میں اس کے پیچھے دوڑتا تھا۔ اس کے سوائے میرے لئے کوئی کام نہ تھا۔ میرا زیادہ تر وقت سبزہ زاروں اور چراگاہوں میں بسر ہوتا تھا۔ سورج کی سنہری شعاعوں میں غسل کرنا، گھاس پر لوٹنا، نرم و نازک گھاس کی کونپلوں پر منہ مارنا اور اٹکھیلیاں کرنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ جب کہ میری ماں میرے پاس ہی بڑے سلیقے کے ساتھ گھاس چرتی رہتی تھی۔

وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ جب میں قدرے جوان ہوا تو کچھ لوگ ہماری چراگاہ میں آئے اور ایک شخص نے میرے گلے میں ایک موٹا سا رسا ڈال دیا۔ یہ لمحہ میرے لئے حیران کن اور تکلیف دہ تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ اب اس نے روز مجھے ایک دائرے میں دوڑانا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چابک ہوتا تھا اور جب میں دوڑتے دوڑتے سست پڑ جاتا تو چابک کی ضرب میرے انگ انگ میں درد کی لہر دوڑا دیتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میری زندگی "گردش مدام" کے سانچے میں ڈھل گئی ہے۔ مجھے تربیت دینے والا شخص خاصا ظالم تھا وہ اپنے چابک کا استعمال بے تحاشا کرتا تھا۔ مجھے غصہ تو آتا تھا مگر گھٹ کے رہ جاتا تھا۔ قصہ مختصر، تربیت کا یہ تکلیف دہ دور بھی بیت گیا۔ اب میں ایک تجربہ کار گھوڑا تھا، جسے تانگے کے آگے جوتا جا سکتا تھا اور شخصی سواری کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد مجھے ایک خوشحال زمیندار کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ وہ بہت مہربان تھا اور میری نگہداشت انتہائی توجہ سے کرتا تھا۔ میرا کام اسے شہر لے جانا اور وہاں سے لانا رہتا تھا۔ وہ جب شان و شوکت کے ساتھ مجھ پر سوار ہوتا تھا تو میری گردن فخر و ناز سے اکڑ جاتی تھی۔ گاہے گاہے اس کے بچے کھیل کے طور پر

مجھ پر سواری کرتے تھے۔ مجھے ان بچوں سے بہت پیار تھا۔ ان کی مسرت بھری آوازوں اور اچھل کود سے مجھے اپنا بچپن یاد آجاتا تھا۔

اک کھلونا جوگی سے کھو گیا تھا بچپن میں ڈھونڈتا پھرا اس کو وہ نگر نگر تنہا

مسرت کے یہ لمحے جلد گزر گئے۔ ایک بار میرا آقا کسی قرض میں پھنس گیا اور اس نے مجھے ایک امیر سوداگر کے پاس بیچ دیا۔ اس سوداگر کے پاس ایک خوبصورت تانگا تھا اس نے مجھے تانگے کے آگے جوتا اور اس کا تمام خاندان تانگے پر سوار ہو گیا۔ اس نے مجھے چابک پر چابک لگائے تاکہ میں انھیں کھینچوں۔ مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے چابک سے مجھے بار بار پیٹا۔ مگر اس کے ظلم و ستم نے میرے اندر بغاوت کے جذبات بیدار کر دیے اور بجائے آگے جانے کے پیچھے کی طرف سرکنے لگا۔ تانگے میں سوار بچے اس کے لئے تیار نہ تھے چناں چہ وہ خوف زدہ ہو گئے اور ایک بچہ تانگے سے نیچے گر گیا۔ سوداگر نے یہ صورت حال دیکھ کر مجھے خوب پیٹا مگر میں نے انتہائی جرات سے اس مار پیٹ کو برداشت کیا۔ اس برداشت اور صبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے کئی روز تک مجھے اصطبل میں باندھے رکھا۔ اس دوران میں مجھے معمولی چارا ملتا اور ہر فرد مجھے نفرت کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ میں یہی سوچ کر چپ تھا کہ:

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

میری بے رخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مجھے ایک اور زمیندار کے ہاتھ بیچ دیا جو مجھ پر سوار ہو کر اپنے کھیتوں میں جایا کرتا تھا۔ دیہاتی میرے مالک کا بہت احترام کرتے تھے اور مجھے بھی اس پر فخر تھا۔ ایک ملازم میری دیکھ بھال کرتا تھا اور مجھے صاف ستھرا اور چاق چوبند رکھتا تھا۔ اس نگہداشت کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری جلد بہت خوبصورت اور چمکدار ہو گئی تھی اور میرا آقا بڑی محبت سے میری گردن پر ہاتھ پھیرتا تھا۔

مگر خوشی کے یہ دن بھی عارضی ثابت ہوئے۔ ایک دن وہ مجھ پر سوار تھا۔ راستے میں ایک نالا آیا جس میں پانی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ نالے کی چوڑائی زیادہ تھی۔ مالک نے چاہا کہ میں ایک چھلانگ میں اسے عبور کر جاؤں مگر یہ بات میرے بس میں نہ تھی۔ میں نے آقا کے حکم سے سرتابی نہ کی۔ صورت حال کو ناممکن سمجھتے ہوئے بھی چھلانگ لگا دی۔ نتیجہ معلوم کہ میں پھسلا۔ میری پشت سے میرا مالک بھی منہ کے بل گرا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا اور میری ٹانگ کا جوڑ ہل گیا۔ مجھے کچھ عرصے کے بعد حیوانات کے ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔ وہاں میرا علاج ہوتا رہا۔ قدرے تندرست ہوا تو مالک نے مجھے ایک اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

وہ ایک نیک دل انسان تھا اور کبھی کبھار مجھے سواری کے لئے استعمال کرتا تھا میں اس کے پاس کئی سال تک رہا۔ اس کا بیٹا بھی مجھ پر سواری کیا کرتا تھا۔ اس کے گھر میں مجھ پر بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے مگر یہ مالک اس قدر نیک اور مہربان تھا کہ اس نے مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی بلکہ میری پہلی خدمات کی وجہ سے اپنے پاس ہی رکھا۔ کھانے پینے اور نگہداشت میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ اب میں ہوں اور عمر کا وہ حصہ جس میں قویٰ کمزور پڑ جاتے اور تب و تاب دھندلا جاتی ہے۔ اب میں کوئی کام نہیں کرتا۔ اصطبل میں بندھا رہتا ہوں یا چراگاہوں اور سبزہ زاروں میں چل پھر کر جوانی کے دن یاد کرتا رہتا ہوں۔ بس اب موت کا انتظار ہے جو مجھے زندگی کی چراگاہوں سے موت کے گڑھے میں لے جائے گی۔

اپنے کاندھوں پہ لیے پھرتا ہوں اپنی ہی صلیب خود مری موت کا ماتم ہے مرے جینے میں

## ایک شیر کی آپ بیتی

میں صحرائے کالاہاری کا ایک بوڑھا شیر ہوں اور اس وقت ایک غار میں پڑا اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہا ہوں۔ شکار کرنا اب میرے بس کی بات نہیں رہی۔ لیکن زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ کسی کو مجھ پر رحم بھی نہیں آتا۔ زندگی غم اور دکھ کی تصویر بن چکی ہے۔ اب میں ہوں، میری تنہائی ہے اور میرے غم ہیں لیکن یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا ہوں:

غم کی دنیا رہے آباد شکیلؔ مفلسی میں کوئی جاگیر تو ہے

کچھ خبر نہیں کہ کب وہ موت آئے گی جو مجھے اس درد کی دنیا سے نجات دے گی۔ اس سے پہلے کہ میری زندگی ختم ہو جائے، میں آپ کو اپنی داستانِ حیات سنانا چاہتا ہوں۔

میری ماں ایک صحت مند اور طاقتور شیرنی تھی اور میرا باپ ایک بارعب ببر شیر تھا۔ پورے جنگل پر اس کا رعب اور دبدبہ تھا۔ سارے جانور اس کی دھاڑ سنتے ہی سہم جاتے تھے۔ جب میری پیدائش کا وقت آیا تو میری ماں ایک غار میں چلی گئی اور وہاں اس نے ہم تین بہن بھائیوں کو جنم دیا۔ میں اور میری دو

ہیں، اسی غار میں تقریباً دو تین ماہ تک اپنی ماں کے دودھ پر پلتے رہے۔ ہماری ماں جب بھی باہر شکار پر جاتی تو ہمیں تاکید کر جاتی کہ ہم غار سے باہر نہ نکلیں کیوں کہ جنگل میں لگڑ بگڑ بھی رہتے تھے اور یہ شیر کے بچوں کے جانی دشمن ہوتے ہیں۔ موقع ملتے ہی انھیں چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔

جب ہماری ماں شکار کر کے واپس آتی تو غار کے باہر ہلکا سا غراتی اس کی مانوس آواز سن کر ہم اچھلتے کودتے باہر نکل آتے اور اپنی ماں سے لپٹ جاتے۔ وہ ہمیں پیار کرتی اور ہمارے جسموں کو چاٹتی پھر وہ بڑے سکون سے لیٹ جاتی اور ہم پیٹ بھر کر اس کا دودھ پیتے اور اپنی ماں سے کھیلتے۔ کبھی اپنی ماں کی دم کو اپنے پنجوں اور منہ میں جھنجوڑتے اور کبھی اُس کے اُوپر چڑھ کر بیٹھ جاتے۔ یہ دن ہماری زندگی کے بڑے خوبصورت دن تھے اور ماں کے سائے میں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ جب ہم تقریباً پانچ یا چھ ماہ کے ہوئے تو ہماری ماں ہمیں اپنے ساتھ باہر لے جانے لگی تاکہ ہمیں جنگل کے قانون کے آداب سکھائے اور شکار کرنے کے داؤ پیچ سمجھائے۔ جب پہلے دن اپنی ماں کے ساتھ باہر گئے تو اس نے اپنے گروہ کے دوسرے شیروں سے ہمارا تعارف کرایا۔ یہ گروہ آٹھ شیروں پر مشتمل تھا۔ اس میں پانچ جوان شیرنیاں دو بچے اور ایک ببر شیر تھا، جو ہمارا باپ تھا۔ سب نے ہمارا استقبال کیا اور یوں ہم بھی بہت سے اندیشوں اور امیدوں کا دامن تھامے، اس گروہ میں شامل ہو گئے۔

ڈر ہم کو بھی لگتا ہے، رستے کے سناٹے سے          لیکن ایک سفر پر اے دل، اب جانا تو ہو گا

شیروں کی یہ عادت ہے کہ وہ ایک گروہ کی صورت میں مل جل کر رہتے ہیں اور اکٹھے شکار کرتے ہیں اور مل جل کر کھاتے ہیں۔ شکار کرنے کی ذمہ داری شیرنیوں کی ہوتی ہے۔ جب کسی جنگلی جانور کو شکار کر لیا جاتا ہے تو سب سے پہلے اس گروہ کا سردار جو ببر شیر ہوتا ہے، اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ جب وہ اپنا پیٹ بھرنے کے بعد شکار سے تھوڑی دور جا کر بیٹھ جاتا ہے تو گروہ کے دوسرے افراد شکار پر پل پڑتے ہیں اور اپنی اپنی ضرورت کے مطابق شکار کے گوشت سے اپنا اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ پھر کسی سایہ دار درخت کے نیچے سو کر اپنا وقت گزارتے ہیں۔ جب شیروں کا پیٹ بھرا ہوتا ہے تو وہ دوسرے جنگلی جانوروں کو تنگ نہیں کرتے بلکہ انھیں آرام سے چرنے دیتے ہیں۔ میں بھی تین چار سال تک اس گروہ میں شامل رہا اور پھر میرے باپ نے مجھے اس گروہ سے الگ کر دیا تاکہ میں خود اپنی دُنیا پیدا کروں اور اپنا الگ گروہ بناؤں۔ میں اس جنگل میں قریباً ڈیڑھ سال تنہائی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اب میں پورے پانچ سال کا ایک جوان شیر تھا اور میری دھاڑ سے جنگل کانپ جاتا تھا مگر مجھے اپنا گروہ بنانے کے لیے کسی دوسرے گروہ کے سردار شیر کو لڑائی کر کے شکست دینا تھی۔ میں اس تلاش میں جنگل میں گھومتا رہتا تھا تاکہ اپنے مقصد کو پا سکوں۔

ایک دن یوں ہوا کہ میں گھومتا گھومتا جنگل کے ایک دُور دراز علاقے میں نکل گیا یہ علاقہ کسی دوسرے شیر کا تھا۔ میری موجودگی کا احساس کر کے اس علاقے کے شیروں کا سردار مجھے بھگانے کے لیے دھاڑتا اور غراتا ہوا آیا۔ وہ دُور دُور سے مجھے ڈرانے کے لیے دھاڑتا اور غراتا رہا۔ مگر میں نے اس کے چیلنج کو قبول کیا اور بے خوف و خطر اس سے ٹکرا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک تجربہ کار اور طاقتور شیر تھا مگر میری بھی بھرپور جوانی تھی اور وہ بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچ چکا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک ہم ایک دوسرے سے لڑتے رہے بالآخر میری طاقت اور جوانی اس کی طاقت اور تجربے پر غالب آئی اور وہ شکست تسلیم کر کے ایک طرف بھاگ گیا۔ میں بڑے فاتحانہ انداز میں اس کے گروہ کی طرف آیا۔ اس گروہ کی شیرنیوں نے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنا نیا سردار تسلیم کر لیا۔ اب میری کیفیت کچھ یوں تھی:

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں، ہر چیز مقابل آ جائے          منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے

مجھے اس گروہ کا سردار بننے پر بڑی خوشی ہوئی اور میں نے سرداری کے فرائض بڑی خوبصورتی سے ادا کرنا شروع کر دیے۔ ایک عرصہ تک میرا گروہ جنگل کے اس علاقے میں شکار کرتا رہا اور شیرنیاں میری خدمت پر ہمہ وقت سربستہ رہیں۔ ہم سب مل کر راتوں کو شکار کرتے اور ہمارے شکار کا نشانہ بننے والوں ہرن، چیتل، زیبرے، جنگلی بھینسے اور زرافے ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھار ہم کسی اکیلے ہاتھی کو بھی گھیر لیتے تھے۔ یہ زندگی بڑی مصروف زندگی تھی۔ مجھے کوئی فکر نہیں تھا۔ مگر کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا کہ اب میں بھی بڑھاپے کی طرف گامزن ہوں اور میرے اندر پہلی سی پھرتی اور توانائی نہیں رہی۔ میں اپنی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے جنگل میں دوڑتا اور گھومتا رہتا تاکہ کسی کو میری کمزوری کا احساس نہ ہو۔ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ جنگل کا سب سے بڑا قانون طاقت ہے اور جس کے پاس طاقت ہو وہی بادشاہ ہے لیکن یہ طاقت ہمیشہ کسی کے پاس نہیں رہتی۔ دُنیا کا دستور طاقت وروں کو کمزور اور کمزوروں کو طاقتور بناتا رہتا ہے۔

جس سر کو غرور آج یاں تاجِ وری کا          کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

CamScanner
CamScanner

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک نامعلوم خوف میرے دل میں سر اٹھانے لگا کہ اگر کوئی اور طاقتور شیر ادھر نکل آیا اور اس نے میری سرداری کو چیلنج کر دیا تو معاملہ خراب ہو سکتا ہے۔ آخر کار اس خوف کے خدشے کا حقیقت کی صورت اختیار کرنے کا وقت آگیا اور ایک جوان شیر ادھر نکل آیا۔ میں نے اسے ڈرانے دھمکانے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ اس نے میرے چیلنج کو قبول کیا اور مجھ سے ٹکرا گیا۔ ایک خوفناک مقابلے کے بعد اس نے مجھے شکست دے دی اور میرے گروہ کا سردار بن گیا۔

اس مقابلے میں مجھے بہت سے زخم آئے اور میں ایک نڈھال زخمی جسم کے ساتھ جنگل کے دوسرے کونے کی طرف نکل گیا۔ کچھ دن تو میں ہلکا پھلکا شکار کرتا رہا جس سے میری توانائی کسی حد تک بحال رہی مگر اب بڑھاپے نے مجھے اپنے شکنجے میں پوری طرح جکڑ لیا اور اس وقت میں ایک غار میں پڑا دم توڑ رہا ہوں۔ دیکھیں کب موت کا فرشتہ آکر مجھے اس کرب سے نجات دلاتا ہے۔

## ایک بلبل کی آپ بیتی

میں ایک بلبل ہوں۔ آج میرا گھر ایک قید خانہ ہے۔ جس کے دریچوں سے بہار نظر آتی ہے نہ پھولوں کی رنگینی۔ اب پھول کا کھلنا میرا نصیب ہے، نہ ہی وہ حسین نغمے جو میں نے کبھی گائے تھے۔ اب تو ایک افسردگی ہے جو جسم و جاں کا مستقل حصہ ہے۔ ایک یادِ ماضی ہے جو زندگی کی دوڑ کٹنے نہیں دیتی۔

آتا ہے یاد مجھ کو وہ گزرا ہوا زمانہ ‏ ‏ ‏ ‏ وہ باغ کی بہاریں، وہ پھولوں کا مسکرانا

کبھی میرا مسکن باغ تھا۔ شاخ شاخ پھرنا اور پھول پھول جانا میرا مشغلہ تھا۔ یہ شغل مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ محبوب تھا۔ بہاروں میں جب پھولوں کا جوش اپنے کمال پر ہوتا تھا تو میرے دل سے نغمے ابلتے اور گیت بکھرتے تھے۔ خوش مزاج انھیں محبت کے گیتوں کے نام سے پکارتے تھے۔ اور افسردہ دل اسے فریاد کہ کر اپنے دل کا عکس دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ گویا میرے دم سے گلشن کی رونق تھی۔ یقین کیجیے کہ اگر میں اور پھول نہ ہوتے تو اردو ادب کے بہت سے گوشے ویران، سنسان اور اداس نظر آتے۔ آتش کے مشہور شعر میں میرا ذکر موجود ہے:

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے رُوبرو کرتے ‏ ‏ ‏ ‏ ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس دنیا میں کب آنکھ کھولی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے خود کو ایک درخت کے نیچے گھاس کی نرم و نازک کونپلوں پر پھدکتے اور لڑھکتے پایا تھا۔ مجھے اس وقت بہار کی رعنائیوں اور خزاں کی افسردگیوں کا کوئی شعور نہیں تھا۔ معلوم نہیں کہ شعور آتے آتے کتنے ہی موسم بیت گئے تھے اور کتنے ہی پھول مسکرا کر دم توڑ گئے تھے۔ بہر حال جب اُڑنا آیا، شاخوں پر بیٹھنے اور گرد و پیش پر نظر ڈالنے کا شوق ابھرا تو شاخ شاخ پر پھول نظر آئے۔ میرا دل خود بخود ان پھولوں کی جانب کھنچ گیا۔ میں بے خودی کے عالم میں پھولوں کو تکتا رہتا اور یہ سلسلہ پہروں قائم رہتا۔ مختلف شاخوں پر اڑتا رہتا اور رات کو گھنی پتیوں ہی کے درمیان بسیرا کر لیتا تھا۔ بس میں تھا اور پھول کی رنگینیاں۔ میں رنگ و نور کی دنیا میں اس قدر گم تھا کہ گرد و پیش کا کوئی ہوش نہ تھا۔ محبت کی یہ رنگینی زندگی کی سب سے قیمتی متاع تھی۔ زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی۔ موسم گزرتا گیا، بہار مرجھا گئی اور خزاں نے پورے باغ کو بے لباس اور افسردہ کر دیا۔

فنا ہے حسن کو، دولت کو، زندگانی کو ‏ ‏ ‏ ‏ جہاں میں تو نہ کوئی باغ، بے خزاں دیکھا

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے دل میں فراق کی خلش کو محسوس کیا۔ دل بار بار شاخوں کا طواف کرنے پر مجبور کرتا تھا کہ وہاں کبھی محبوب کا حسن لہکتا تھا۔ مگر اب کانٹوں سے لبریز شاخوں کو دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ میں نے مایوسی کے اس عالم میں بھی باغ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ وہیں کا ہو رہا۔ یہاں تک کہ قدرت کو رحم آیا اور شاخوں نے سبز کونپلوں کا حسین لباس زیب تن کر لیا۔ ہولے ہولے کلیاں ابھریں، چٹکیں، پھوٹیں، مسکرائیں اور پھول بن گئیں اور بہاروں کے حسن نے مجھے ایک بار پھر نغمہ زن ہونے پر مجبور کر دیا۔

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج ‏ ‏ ‏ ‏ اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

میں نے ایک آشیانہ بھی بنا لیا تا کہ سکون سے رہ سکوں مگر بجلیوں کا خوف ہر وقت رہنے لگا۔ ایک رات بادل گھر کے آئے اور اتنا ٹوٹ کر برسے کہ جل تھل ہو گیا۔ میں اپنے گھونسلے میں دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ بجلی کی چمک اور رعد کی کڑک دل دہلا رہی تھی۔ آخر وہ لمحہ بھی آگیا، جس کا ڈر تھا۔ ایک دلدوز گرج کے ساتھ بجلی لپکی اور یوں لگا جیسے پوری کائنات لرز گئی ہو۔ پتا ہی نہ چلا کہ کہاں ہوں اور کیسا ہوں۔ اس عالم میں کتنا ہی وقت بیت گیا ہو گا۔ یہاں تک کہ

CamScanner

سورج کی شعاعوں نے چمن کو روشن کیا۔ دھوپ کی گرمی نے احساس بیدار کیا۔ آنکھیں کھولیں تو نظام ہی درہم برہم نظر آیا۔ شاخ ٹوٹی ہوئی تھی، پھول مٹی میں بکھرے ہوئے تھے اور ٹوٹ ٹوٹ کر سرنگوں ہو چکے تھے۔ کئی پرندے جان ہار گئے تھے اور پورا باغ، عالم بہار میں بھی ویرانہ سا لگتا تھا۔ میں نے زخمی جسم کو سہلایا اور آشیانے کی تعمیر کے لئے پھر سے تنکوں کو یکجا کرنا شروع کر دیا۔ مایوسی نے گھیر رکھا تھا اور دل پھر کسی بے نام خوف سے لرز رہا تھا۔

شہر کیسا مختلف لگتا ہے اپنے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے

خدا خدا کر کے آشیانہ بنا اور سکھ کا سانس لیا۔ اور اس بار پھر بہار آئی اور میری دنیا ایک بار پھر مہک اٹھی۔ میری نفسیاتی کیفیت عجیب وغریب تھی۔ میں زندگی کا زیادہ سے زیادہ عرصہ پھول کے روبرو گزارنا چاہتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کا عرصہ بہت کم رہ گیا ہے۔ پھول کے پاس باغباں کا وجود بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ جو بھی پھول کے جانب تکتا، میرے دل میں حسد کا ایک جذبہ ابھرتا۔ میں اس کو روکنے اور ٹوکنے کے ہزاروں جتن کرتا مگر وفا اور محبت کی زبان سمجھنے والا کون ہے۔

کچھ کہہ نہ سکے اہل وفا اہل جہاں سے واقف تھا یہاں کون محبت کی زباں سے

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ایک دن میں نے زمین پر کچھ دانے بکھرے دیکھے اور کچھ پھول بھی ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے۔ میرے دل میں آرزو نے کروٹ لی۔ میں دانوں اور پھولوں کی جانب ایسا لپکا کہ اس کے بعد اڑ نہ سکا۔ وہ تو ایک دھوکا اور ایک دام تھا، جس کا میں شکار ہو چکا تھا۔ میری نرم ونازک ٹانگیں، صیاد کی بے رحم گرفت میں تھیں۔ اس نے مجھے پنجرے میں ڈال دیا۔ میں نے چمن کو افسردہ نگاہوں سے دیکھا۔ صیاد کے ظلم وستم کی انتہا دیکھیے کہ اس نے میرا پنجرہ میں چمن کی دیوار کے پیچھے رکھ دیا کہ میں باغ کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ صیاد پنجرے میں دانہ باقاعدگی سے رکھتا تھا۔ مگر میرا دل تھا کہ تڑپ رہا تھا۔ میں دانے پانی کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھتا تھا۔ کاش صیاد میری زبان کو سمجھ سکتا۔ میں تو بس گلہ ہی کر سکتا ہوں۔

بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ قسمت میں قید تھی لکھی فصل بہار میں

بس اب میں ہوں اور ماضی کی وہ سہانی یادیں جو مجھے اب تک زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن کیا خبر کہ نجانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے۔

## ایک موٹر سائیکل کی آپ بیتی

میں ایک پرانا موٹر سائیکل ہوں۔ آج میں اپنی زندگی کے آخری دن ایک کباڑیے کے ہاں گزار رہا ہوں۔ میرا زوال اب اپنے عروج پر ہے۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ بکھر چکا ہے۔ میری چمک دمک جو کبھی لوگوں کو متوجہ کرتی تھی، اب زنگ کی تہوں میں کہیں چھپ چکی ہے۔ کباڑیہ روز میرے جسم کا ایک حصہ الگ کرتا ہے اور بیچ دیتا ہے۔ گویا ایک قیامت ہے جو روز گزرتی ہے۔

اے واعظ ناداں کرتا ہے، تو ایک قیامت کا چرچا یہاں روز نگاہیں ملتی ہیں، یہاں روز قیامت ہوتی ہے

عرف عام میں مجھے یاماہا 100CC کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میرا ماڈل 1994ء کا ہے۔ میری تخلیق یاماہا موٹر سائیکل کمپنی کے اس کارخانے میں ہوئی جو اس کمپنی کے تعاون سے پاکستان میں لگایا گیا تھا۔ میرا ایک ایک پرزہ ماہر انجینئروں کی نگرانی میں تیار کروا کر فیکٹری کی خودکار مشینوں کے ذریعے جوڑا گیا تھا۔ جب میری ساخت کا کام مکمل ہوا اور رنگ وروغن سے میرے حسن وجمال کو انتہائی دیدہ زیب صورت عطا کی گئی تو مجھے فروخت کے لئے ایک شوروم میں بھیج دیا گیا۔ وہاں میرے اور بھی ہم جنس بڑے سلیقے اور قرینے سے رکھے گئے تھے۔ مجھے ان سے مل کر بہت مسرت ہوئی۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

(ہمدم دیرینہ: پرانا دوست۔ مسیحا: علاج کرنے والا، مسیحائی کرنے والا۔ خضر: حضرت خضرؑ کی طرف اشارہ، مراد رہنما)

میرا شوروم کا قیام بہت مختصر رہا اور آرام وسکون کے یہ لمحے طویل نہ ہو سکے۔ ایک صاحب شوروم میں آئے اور مجھے پسند کرنے کے بعد قیمت ادا کی اور اپنے گھر لے گئے۔ گھر پہنچنے پر انھوں نے میری چابی اپنے بیٹے کے سپرد کر دی۔ اس لڑکے کا نام حذیفہ تھا۔ یہ کالج میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا اور انتہائی ذہین اور محنتی تھا۔ اس نے مجھے بڑی احتیاط سے رکھا۔ وہ مجھے صرف کالج آنے جانے یا اکیڈمی میں ٹیوشن پڑھنے کے لیے جاتے ہوئے استعمال کرتا تھا اور میری جھاڑ پونچھ اور صفائی کا اسے بہت خیال تھا۔ جو بھی مجھے دیکھتا یہی سمجھتا کہ ابھی شوروم سے نکلوا کر مجھے لایا گیا ہے۔ میری زندگی کے یہ دو سال جو میں نے حذیفہ کے ساتھ

گزارے، ناقابل فراموش اور خوبصورت تھے۔ وہ دن مجھے آج بھی یاد آتے ہیں تو مجھے اُداس کر جاتے ہیں۔

یادوں کا اک جھونکا آیا ہم سے ملنے برسوں بعد　　پہلے اتنا روئے نہیں تھے جتنا روئے برسوں بعد

دو سال کے بعد حذیفہ میڈیکل کالج میں چلا گیا اور میری قسمت اس کے چھوٹے بھائی کے ساتھ منسلک ہو گئی۔ وہ بھی کالج کا طالب علم تھا مگر اپنی عادات کے اعتبار سے حذیفہ کا متضاد تھا۔ اسے تیز رفتاری کا شوق تھا۔ اس کا یہ شوق اکثر اوقات مجھے سڑک کے کھڈوں میں جھونک دیتا جس سے مجھے شدید قسم کے جھٹکے لگتے اور میرا جوڑ جوڑ درد سے بلبلا اُٹھتا۔ پھر اسے ایک پہیے پر بائک چلانے کا شوق چرایا اور اس نے اپنے شوق کی تکمیل میں میرے رنگ و روغن اور ظاہری حسن کو ماند کر دیا۔ انتہائی بے پروائی کے ساتھ استعمال کرنے کی بنا پر میرے انجن میں خرابیاں پیدا ہونے لگیں اور اسی بے احتیاطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن اس نے مجھے ایک درخت سے ٹکرا دیا۔ میری ہیڈلائٹ ٹوٹ گئی اور اگلا پہیا ٹیڑھا ہو گیا۔ جب کہ اس کی اپنی بھی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ورکشاپ اور اسے ہسپتال جانا پڑا۔

میں ایک ماہ تک ورکشاپ میں رہا اور میری مرمت کا کام مکمل کر دیا گیا لیکن میرا ظاہری حسن ماند پڑ گیا۔ حذیفہ کے بھائی کو تندرست ہونے میں تین چار ماہ لگ گئے۔ مجھے دوبارہ اسی کے سپرد کر دیا گیا۔ اس طرح میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ دور میری زندگی کا کوئی خوش گوار دور نہیں تھا۔ تین سال تک مسلسل مجھے رنج والم کی چکی میں پسنا پڑا۔ حذیفہ کے بھائی کے دوست بڑی بے دردی سے مجھے استعمال کرتے۔ گھریلو نوکر بھی مشق ستم روا رکھتے اور ہر شخص جہاں چاہتا مجھے رگید تا پھرتا۔ جگہ جگہ سے میرا رنگ اُڑ گیا اور پانچ سال میں میری حالت پر ایک بوسیدگی طاری ہونے لگی۔ حالاں کہ احتیاط کے تقاضے اگر پورے کیے جائیں تو پانچ سال میں موٹر سائیکل کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ پانچ سال بعد مجھے فروخت کر دیا گیا اور ایک ڈکان دار نے مجھے خرید لیا۔ یہ ڈکاندار اچھا آدمی تھا۔ اس نے مجھے ورکشاپ بھجوا دیا میری اوور ہالنگ اور مرمت کا ضروری کام کروایا اور پھر مجھے استعمال کرنا شروع کیا۔ اس کے اس حسن سلوک سے میری حالت بہت بہتر ہو گئی اور میں ایک بار پھر اپنے آپ کو توانا محسوس کرنے لگا۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے　　آتے ہیں جو کام دوسروں کے

میں پورے پانچ سال ڈکان دار کے پاس رہا اور اس کا کام بڑی وفاداری سے انجام دیتا رہا۔ پھر یوں ہوا کہ ڈکان دار نے ٹافیوں کی ایک ایجنسی لے لی اور اسے ایک "پک اپ" خریدنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ وہ مختلف ڈکانوں تک ٹافیاں پہنچا سکے اس لیے اس نے مجھے فروخت کر دیا اور ایک گجر نے مجھے خرید لیا۔

یہ گجر بڑے کمال کا آدمی تھا اور اس کا نام "شیرو" تھا۔ بھرا بھرا جسم اور لمبی لمبی مونچھیں۔ وہ گاؤں سے دودھ لا کر شہر کے مختلف محلوں میں لوگوں کے گھروں میں بیچتا۔ وہ روزانہ میرے سامنے دودھ میں پانی ملاتا لیکن پھر قسمیں کھا کھا کر لوگوں کو خالص دودھ بنا کر بیچتا۔ مجھے حیرت ہوتی کہ یہ کس قسم کا انسان ہے مگر اپنے ارد گرد کے انسانوں کا مشاہدہ کرتا تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی کیوں کہ اس قسم کے بہت سے انسان اسی دنیا میں موجود تھے:

شہر میں کوئی بشر ایسا نہ تھا　　جس کے چہرے پہ کوئی چہرا نہ تھا

شیرو کے ساتھ رہتے مجھے ایک عرصہ ہو گیا۔ یہ مجھے بڑے بے دردانہ انداز میں استعمال کرتا رہا اور دودھ کی کئی ڈرمیاں پیچھے لٹکا کر گاؤں سے شہر میں لاتا رہا۔ کچے راستے کے کھڈوں نے میرے انجر پنجر کو ہلا کر رکھ دیا۔ نوبت یہ آ گئی کہ دوڑتے ہوئے مختلف قسم کی آوازیں میرے جسم کے مختلف حصوں سے نکلتی تھیں اور ایسا سماں بندھ جاتا جس کا نقشہ پطرس بخاری نے اپنے مضمون "مرحوم کی یاد میں" کھینچا ہے۔ میرا انجن ڈھول میں اٹا رہتا اور رفتہ رفتہ میرا انجن خراب سے خراب تر ہوتا چلا گیا۔ پھر یوں ہوا کہ کسمپرسی کی حالت میرا مقدر بن گئی۔ اور پھر اس نے مجھے ایک دن ایک کباڑیے کے ہاتھ چند سو روپوں کے عوض فروخت کر دیا۔ جہاں میں دھیرے دھیرے موت کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

## پرانی کار کی آپ بیتی

دیکھنے والے میری اس خستگی اور بوسیدگی پر نہ جا۔ کبھی میں بھی ہر نگاہ کا مرکز تھی۔ کبھی میں بھی بازار میں گراں قیمت تھی۔ لوگ مجھے خریدنا اور مجھ میں سفر کرنا پسند کرتے تھے۔ میں کبھی سٹیٹس سمبل تھی۔ آہ! لیکن آج زمانے کی گردش نے مجھے کہاں لا پھینکا ہے۔

اے ہم نشیں! کلام مرا لا کلام ہے　　سن! زندگی تغیر پیہم کا نام ہے

میں ایک ٹیوٹا کرولا کار ہوں۔ میری جنم بھومی جاپان ہے۔ جہاں دُنیا کی خوبصورت ترین کاریں، مختلف ماڈلوں اور ڈیزائنوں میں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ اپنے حسن و جمال کی وجہ سے پوری دُنیا میں پسند کی جاتی ہیں۔ آج سے ٹھیک تیس سال پہلے 1978ء میں مجھے ٹیوٹا کمپنی کے کارخانے میں تیار کیا گیا تھا۔ میرا ایک ایک

پرزہ خودکار مشینوں کے ذریعے بنایا گیا۔ ڈھانچا تیار کرنے کے بعد مشینی روبوٹس کے ذریعے میرا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ پر فٹ کیا گیا۔ ماہر کاریگروں کے ہاتھوں سے مجھے تکمیل کے مختلف مراحل سے گزارا گیا اور پھر انتہائی تجربہ کار انجینئرز نے ہر زاویے سے میری پڑتال کی اور مجھے ہر طرح درست ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ تب کہیں جا کر میں اس قابل ہوئی کہ مجھے ٹیوٹا فیکٹری کے شوروم میں منتقل کیا جائے۔ گویا:

اُفق کو اُفق سے ملا دینے والے
یہ رستے ہیں کتنے تھکا دینے والے

جب میں شوروم میں پہنچی تو دنگ رہ گئی۔ وہاں تو میری ہزاروں بہنیں طرح طرح کے رنگوں سے سجی اور خوبصورت ماڈلوں کی صورت میں موجود تھیں۔ ایک سے ایک اعلیٰ، دیدہ زیب اور دلکش۔ آنے والا ہر مہمان ہمیں دیکھتا ہی رہ جاتا اور اس شعر کی تفسیر بن جاتا:

آپ کو دیکھ کر دیکھتا رہ گیا
کیا کہوں، اور کہنے کو کیا رہ گیا

چند روز میں یہاں مقیم رہی اور پھر پاکستان کے لیے میری شپ منٹ کر دی گئی اور میں کراچی پہنچ گئی۔ یہاں مجھے ایک بڑے سے گودام میں منتقل کر دیا گیا اور پھر چند دن کے بعد ایک کار ڈیلر کے شوروم میں پہنچا دی گئی۔ اس نے بڑے سلیقے سے مجھے اپنے شوروم میں سجایا۔ لوگ میرے ماڈل اور حسن کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتے تھے۔ آخر ایک صاحب نے جو پیشہ کے لحاظ سے انجینئر تھے، مجھے خرید لیا اور اپنی کوٹھی کے گیراج میں لے آئے۔

انجینئر صاحب بڑے نفیس طبع آدمی تھے۔ وہ بڑے پیار سے مجھے استعمال کرتے تھے۔ میری دیکھ بھال اور حفاظت انھیں بہت عزیز تھی۔ میں جب بھی گیراج سے برآمد ہوتی تو چمکتی دمکتی ہوئی نکلتی تھی۔ انجینئر صاحب کے دو بچوں کو اسکول لے جانا اور لانا یا پھر کبھی کبھار ان کے گھر والوں کو شاپنگ کے لیے لے جانا میرے فرائض میں شامل تھا۔ میری زندگی کے یہ دن بڑے خوشگوار اور حسین تھے۔ ان کی یادیں اب بھی دل میں چٹکیاں لیتی ہیں اور میں ایک آہ بھر کر رہ جاتی ہوں۔

دس سال تک انجینئر صاحب کے پاس رہی پھر نئے ماڈل کی کار خریدنے کے شوق میں انھوں نے مجھے بیچ ڈالا اور میں اپنے نئے مالک کے قبضے میں آگئی جو پیشے کے لحاظ سے ایک ڈرائیور تھا اور ایک شہر سے دوسرے شہروں تک سواریاں لے جاتا تھا۔ اس نے مجھے ٹیکسی بنا دیا۔ یہ شخص بھی دیکھ بھال میں کوئی کمی نہیں کرتا تھا۔ وقت پر سروس اور تیل کی تبدیلی، صفائی ستھرائی اور دھلائی اس کا مشغلہ تھا۔ اس نے بھی مجھے بڑے پیار سے رکھا۔ مگر مختلف قسم کی سواریاں بیٹھنے سے میری سیٹوں کی وہ آب و تاب نہ رہی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ بعض اوقات بچے بھی ہم سفر ہوتے تھے۔ جو میری سیٹوں کو کرید کرید کر ان میں سوراخ کر دیتے اور بعض تو میری سیٹوں پر اپنا نام لکھنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک انتہائی منحوس لمحہ میری زندگی میں آیا اور میں ایک ٹریکٹر سے ٹکرا گئی۔ حادثہ بڑا جان گسل تھا۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا مسافر زندگی کی بازی ہار گیا۔ میرے مالک ڈرائیور کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے والوں کو معمولی زخم آئے اور میرا انجر پنجر چور چور ہو گیا۔

زندگی اک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ
موت سے بھی ختم جس کا سلسلہ ہوتا نہیں

حادثے کا لمحہ میرے لیے انتہائی غیر متوقع تھا مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔ تقدیر کے لکھے کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ زخمیوں کو ہسپتال بھیج دیا گیا اور مجھے ورکشاپ میں۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ تو میں ورکشاپ کے ایک کونے میں پڑی رہی۔ پھر میری مرمت کی باری آئی۔ مستریوں نے جب میرا معائنہ کیا تو میری کوئی کل سیدھی نہیں تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ انجن کافی حد تک بچا رہا۔ پورے ایک مہینے میں میری مرمت کا کام مکمل ہوا اور ڈینٹنگ پینٹنگ کے بعد خدا خدا کر کے اس قابل ہوئی کہ دوبارہ روڈ پر آ جاؤں۔

میں دوبارہ روڈ پر تو آگئی مگر اب میری وہ شان نہیں تھی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ سڑک پر چلتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوتا تھا۔ میری پک اپ بھی وہ نہیں تھی جس پر میں کبھی فخر کیا کرتی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود میں اپنے مالک کا کام چلاتی رہی۔ اس کی گزر بسر ہوتی رہی لیکن میری مائلیج (Milage) کم ہو گئی اور پٹرول کا خرچ بڑھتا گیا۔ دن گزرتے گئے میرا شباب، ضعیفی کی منزل طے کرنے لگا۔ چلتے ہوئے میرے دروازے کھڑکھڑانے لگے اور پھر دوڑتے ہوئے کھانس کھانس کر رک جانا میرا معمول بن گیا۔ ورکشاپ کے چکر بڑھ گئے اور میری قدر میرے مالک کی نظروں میں کم ہو گئی۔ سید ضمیر جعفری نے شاید میرا نقشہ ان اشعار میں کھینچا تھا:

عجب اک بار سا مردار پہیوں نے اٹھایا ہے
اسے انساں کی بدبختی نے جانے کب بنایا ہے

نہ ماڈل ہے، نہ باڈی ہے، نہ پایہ ہے، نہ سایہ ہے
پرندہ ہے جسے کوئی شکاری مار لایا ہے

لیکن میں اب بھی اس کی خدمت کے لیے سراپا وقف تھی۔ آخرِکار آئے دن کی میری حرکتوں سے تنگ آ گئے اور انھوں نے مجھ سے جان چھڑانے کا